سُنّت اور تجدّد

مسٹر فرید جعفری کے خیالات کا عقلی جائزہ

(نعیم صدیقی)

ہمارا معاشرہ جن دو بنیادوں پر قائم ہے اُن میں سے ایک خدائے واحد کا اقتدارِ برتر ہے جو ہمیں زندگی کی فلاح کے بنیادی اصول اور اجتماعی ضابطہ فراہم کرتا ہے، اور اس کے ساتھ دوسری بنیاد خدائے واحد کے نامزد کردہ مستند نمائندہ، یعنی رسول صلعم کی اتھارٹی ہے جو ضابطۂ خداوندی کی فیصلہ کن تعبیر اور اس کا عملی نمونہ ہمارے سامنے لاتی ہے۔ ان میں سے جس ایک کو متزلزل کر دیا جائے، دوسری اس کے ساتھ از خود تباہ ہو جاتی ہے۔ مسلمان قوموں اور معاشروں کی اجتماعی ہیئت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنی ان دو بنیادوں کا تحفظ کریں۔ دوسری طرف ہر تخریبی طاقت واحد راہِ عمل یہی پاتی ہے کہ ان دونوں یا ان میں سے کسی ایک بنیاد کو اکھیڑ دیں۔ چنانچہ تمام کے تمام فتنے جنہوں نے ملت کو بار بار جھنجھوڑ ڈالا ہے وہی تھے جو یا تو ہمارے عقیدۂ توحید پر حملہ آور ہوئے ہیں، یا ہمارے ایمان بالرسالت پر! باقی ساری چیزیں بالکل سرسری درجے میں خلل انداز ہو سکی ہیں۔ پھر ان دوگونہ فتنوں کا اگر پورا پورا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مخالفانہ حملوں کی زد پر آنے کے لحاظ سے رسالت بہت زیادہ مظلوم رہی ہے۔ رسول کا منصب، رسول کی اتھارٹی، رسول کا اسوہ اور رسول کی سنت کے بارے میں مخالفِ اسلام رجحانات کا اندازہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ادھر سے حملہ زیادہ آسان ہے۔ خدا کی ہستی، خدا کے حقوق و صفات، خدا کے قانون اور خدا کی کتاب سے لڑائی لڑتا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ آدمی دائرۂ اسلام سے باہر جا کھڑا ہو، لیکن رسالت پر حملہ آور ہونے کے لیے ایسے مورچے با سانی مل سکتے ہیں کہ جن سے وار کر کے خدا کے دین اور اسلامی شریعت کے بے شمار تقاضوں کا صفایا کیا جا سکتا ہے اور پھر اپنے آپ کو نہایت شاندار قسم کا مسلمان — بلکہ ماڈرن اور ترقی پسند مسلمان — بنا کے رکھا جا سکتا ہے۔

رسالت کے منصب و حقوق پر اولین حملہ منافقین مدینہ کا تھا۔ یہ لوگ خدا اور اس کی کتاب کو

بظاہر واجب الاطاعت مانتے تھے، لیکن رسول کی یہ اتھارٹی ماننے پر تیار نہیں تھے کہ اس کی بارگاہ سے جو تعبیر احکام الٰہی کی کر کے دی جائے، جو عملی نمونہ قائم کیا جائے، جو تصفیہ معاملات کیا جائے اور جو احکام ہمارے لیے دیئے جائیں وہ بھی کوئی دینی و شرعی قدر و قیمت رکھتے ہیں اور ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا لازم ہے۔ انکار سنت کا یہ اولین اقدام تھا جو ہمارے معاشرہ میں کیا گیا۔ رسالت پر دوسرا بڑا حملہ نظریۂ امامت کے حاملین کا تھا جنہوں نے امامت کا منصب رسالت سے کاٹ کر الگ کر دیا اور اسے رسالت سے برتر قرار دیا۔ اس نظریہ کا منطقی نتیجہ رسالت کے قائل اتھارٹی ہونے کی نفی تھا۔ پھر خوارج تھے جنہوں نے دین کی "اجتماعی ہیئت" کو ایک دینی عامل اور لازمہ ماننے سے انکار کر کے درحقیقت رسالت کے مجموعی عملی نمونہ پر خط نسخ کھینچ دیا۔ پھر رسالت ہی کی اتھارٹی کو تباہ کرنے کے لیے ہمارے ایک بڑے تاریخی گروہ نے سنت کے ریکارڈ کے بالمقابل (PARALLEL) ایک جعلی ریکارڈ میدان میں ڈال دیا، تاکہ یہ سرمایۂ شریعت مشکوک و مشتبہ ہو کر رہ جائے۔ پھر معتزلہ اٹھے جنہوں نے منطق و استدلال کے یونانی سانچے لیے اور ان میں اپنے معتقدات کو ڈھالنے کی مہم شروع کی۔ ان سانچوں سے قرآن و حدیث دونوں ٹکراتے تھے۔ پس قرآن کی حد تک تو انہوں نے یہ طور اختیار کیا کہ جو آیات ان کے ذہنی معیارات کا ساتھ نہیں دے سکتی تھیں ان کو تاویل سے چھیل ڈالا، لیکن جو احادیث ایک طرف اس طرح کی تاویل میں رکاوٹ بنتی تھیں اور دوسری طرف ان کے معیارات سے ٹکراتی تھیں اُن کو ماننے سے انکار کر دیا۔ یعنی بجائے اس کے کہ رسولؐ کے ارشادات ان کے افکار و تاویلات کے اوپر اتھارٹی ہوتے، انہوں نے اپنے ذہنی معیارات کو خود قرآن و حدیث کے اوپر اتھارٹی بنا ڈالا۔

رسالت کے منصب و حقوق پر جہاں یہ شبخون اندر سے مارے جا رہے تھے، وہاں بالکل ابتداء ہی سے کھلے کھلے حملے سامنے سے بھی شروع ہو گئے۔ یعنی مسلمانوں کو مدعیانِ نبوت سے پے در پے سابقہ پڑا۔ خدا کے اقتدار برتر کا قلادہ گردن سے نکالنے کے لیے خدائی کا دعویٰ اتنا کامیاب حربہ نہیں جتنا رسول کی اتھارٹی کے بندھن سے نجات پانے کے لیے ادعائے نبوت کا علم بلند کرنا ہو سکتا ہے۔ اس طریقہ سے نبوت کی دیوار توڑ کر آگے خدا کے اقتدار برتر میں بآسانی نقب لگائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ طلیحہ

سجاح، مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، بعد میں باب ایرانی اور دورِ حاضر میں مرزا غلام احمد قادیانی نے یہی رستہ اختیار کیا۔ لیکن ہمارا معاشرہ ان کھلے اور چھپے، سامنے کے اور پیچھے کے، باہر سے ہونے والے اور اندر سے ہونے والے سارے حملوں کا سدِباب کرتا چلا آرہا ہے۔

منصبِ رسالت اور حقوقِ رسالت پر تازہ ترین حملہ کی ابتدا عبداللہ چکڑالوی نے کی اور پھر اسے چند ذہین حضرات نے جدیدیت کے رنگ میں رنگ کر اس میں ممکن حد تک عقلی زور پیدا کیا۔ عبداللہ چکڑالوی جیسے لوگ مناظرانہ ذہنیت سے اوپر ہو کر سوچنے کے قابل نہیں ہوتے، لیکن حافظ اسلم جیراجپوری جیسے لوگوں کی ذہانت نے انکارِ سنت کو ایک علمی بحث کی سطح تک پہنچا دیا۔ اسی دوران میں ایک اور ذہین تر آدمی اسٹیج پر نمودار ہوتا ہے جو ذہن و فکر کے لحاظ سے انتہائی مغرب زدہ طبقے اور ماحول سے وابستہ تھا۔ اس طبقے اور ماحول میں دین سے فراریت کا رجحان نمایاں تھا۔ اس ذہین تر آدمی نے اپنے طبقے کی نفسیاتی کیفیت کا خوب اچھی طرح جائزہ لے کر انکارِ سنت کا نظریہ ایک ایسے نئے انداز سے اٹھایا کہ جو اس خاص طبقے کو اپیل کر سکے۔ اس طبقے کا لاینحل مسئلہ یہ تھا کہ ایک طرف یہ اسلام سے منسوب بھی رہنا چاہتا ہے اور دوسری طرف مغربی فلسفہ اور جدید تمدن اور کلچر کو اس کے جملہ مفاسد سمیت اپنانا بھی چاہتا ہے۔ اس لاینحل مسئلے کا نہایت سہل حل سنتِ رسول کا انکار تھا جسے اس ذہین تر آدمی نے ان کے سامنے لا کے رکھ دیا کہ رند کے رند بھی رہو اور ہاتھ سے جنت بھی نہ جائے۔ اس طرح رسالت پر ایک نیا حملہ کرنے کے لیے وہ مستقل انسٹی ٹیوشن ہمارے ہاں پروان چڑھا ہے جس کا محور ادارۂ طلوعِ اسلام ہے۔

پاکستان بنا تو قدرتی طور پر قوم کے اجتماعی ذہن نے زور کیا کہ اس نئی اسلامی مملکت کی دستوری اساس معین ہو جائے۔ چنانچہ ہمارے معاشرے کی جو اعتقادی بنیادیں صدیوں سے قائم تھیں انہوں نے اپنے آپ کو "قراردادِ مقاصد" میں نمایاں کر دیا۔ قراردادِ مقاصد یہ کہتی ہے کہ خدا کی حاکمیت کی بنیاد پر اسلامی شریعت و قانون کا نظام پاکستان میں چلے گا اور اس شریعت و قانون کے مآخذ کتاب و سنت ہوں گے۔ جمہوریت، عدل، مساوات اور معاشرتی انصاف کے وہی اسلامی تصورات واجب القبول

ہیں جو قرآن و حدیث کی تعلیم پر مبنی ہوں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ اظہار معاشرہ کے اجتماعی ذہن ـــ جس سے چند افراد کو چاہے کتنا ہی اختلاف ہو ـــ کی صحیح صحیح ترجمانی ہے۔ چنانچہ اس دستوری اظہار پر سارے ملک میں ایک اطمینان کی کیفیت پیدا ہو گئی اور جدید اور قدیم سارے عناصر اس پر متفق ہو گئے۔ اس نے مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور خان لیاقت خاں مرحوم کے ذہنوں کو ہم آہنگ کر دیا جو دو مختلف عناصر کے اونچے درجے کے نمائندے تھے۔

اس قرارداد کے پاس ہو جانے پر اس پر سب سے پہلا حملہ منکرین حدیث ہی نے کیا۔ اور اس حملہ کا تسلسل اب تک قائم ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس میں جو لفظ سنت آ گیا ہے اس کے خلاف بار بار پیچ و تاب دکھایا جا رہا ہے۔

یہ مظلوم قرارداد مقاصد جو صرف ہماری اکثریت ہی کے رجحانات کی نہیں، معاشرہ کے اجتماعی ذہن کی ترجمان ہے، اب اپنے اندر لفظ "سنت" کو شامل رکھنے ہی کی وجہ سے ایک نئے وار کی ہدف بنی ہے یہ وار کراچی کے انگریزی روزنامے "پاکستان اسٹینڈرڈ" کی طرف سے کیا گیا ہے جو ٹھیک اسی مسلم لیگ کا نمائندہ اخبار ہے جس کے دور اقتدار میں قرارداد مقاصد پاس ہوئی تھی۔ یہ تازہ وار جو قرارداد مقاصد، سنت کے انسٹی ٹیوشن اور "ملا" سب کو بیک دم ہدف بناتا ہے ایک ایسا حادثہ ثابت ہوا کہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس پر ہل چل مچ گئی۔ یہ ایک تجرباتی حقیقت ہے کہ معاشرہ کی ایک بنیاد کو جب چھیڑا جاتا ہے تو بسا اوقات فوری ردعمل کے طور پر ایک جذباتی ہیجان کی مدافعت کے لیے برسرِ کار آ جاتا ہے۔ ایسا ہونا بالکل فطری تھا اور ہوا۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ نہایت ٹھنڈے طریق سے شعوری اور استدلالی لحاظ سے بھی اس کا سامنا کیا جائے۔

فرید جعفری صاحب کے ارشادات | پہلے ہم پاکستان اسٹینڈرڈ سے اس کے مدیر فرید جعفری صاحب کے خیالات کو اردو ترجمہ میں پیش کرتے ہیں:۔

"ان (یعنی قائد اعظم) کی ایک غلطی یہ تھی کہ انہوں نے ان مذہبی لوگوں کو کچھ اہمیت دے دی اور ان پر کچھ مہربانی کر دی جو تحریک پاکستان کے دنوں میں ان کے اور ان کے مقصد کے وفادار رہے تھے۔ ان

لوگوں کو آزادی کے ابتدائی سالوں میں نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ اور اگر ایسا کیا جاتا تو خانہ جنگی کا خطرہ تھا۔
۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو مجلس دستور ساز نے قرار داد مقاصد کی شکل میں قوم سے ایک پیمان کیا، ملاؤں کو فتح حاصل ہوگئی۔ یہ پاکستان میں ملا راج کی ابتدا تھی۔ اب اس کے بعد ہم مذہبی لوگوں کے لیے لفظ ملا کا استعمال کریں گے، کیونکہ جونہی سنت کا لفظ شامل کیا گیا، ملا ازم نے ملک میں سر اٹھا لیا۔ ملا ازم اتنی ہی خطرناک طاقت بن گیا جتنی اشتراکیت تھی۔ سنت (رسول کی روایات) کی تعیین کرنے کا حق کسے تھا؟ پاکستان میں اسلام کا دعویٰ کرنے والے بہتر (۷۲) سے زائد فرقے تھے۔ ان میں سے ہر ایک قرآن کی اپنی سی تعبیر کرتا تھا، اور یہ ساری تعبیریں سنت کی روشنی میں کی جاتی تھیں۔ اس لفظِ سنت کا شمول تجدد پسندوں کے لیے پیغامِ موت تھا، اور اس کی وجہ سے مذہبی تحریک کا اپنے پورے زور شور اور تسلیطنت کے ساتھ آغاز ہوگیا۔ تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی تھی۔ یہ سنت ہی تھی جس نے اسلام کے ابتدائی جمہوری مزاج میں بگاڑ پیدا کیا۔ یہ سنت ہی تھی جس نے مسلمانوں کو متعدد فرقوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کی وحدت کو پارہ پارہ کیا۔ یہ سنت ہی تھی جس نے بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں مذہبی لوگوں کو غیر معمولی اہمیت دلوائی، اور یہ سنت ہی تھی جس نے دولتِ عثمانیہ کو ناقابلِ علاج روگیوں کا گھر بنا دیا۔ کوئی دو ماہرِ رسولؐ کی روایات کی تعبیر کے معاملے میں کبھی متفق نہیں ہو سکے۔

اس عبارت کو براہِ کرم ایک بار، دو بار، چار بار توجہ سے پڑھیے اور لفظوں کے اس ڈھیر میں عقلی استدلال کی جستجو کیجیے۔ آپ کو اندھی جذباتیت کے سوا اس میں سے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ یہ عبارت ایک اشتعال اور ایک جھنجھلاہٹ سے زائد کوئی چیز پیش نہیں کرتی۔ لکھنے والے کے دل کا ایک اُبال ہے جسے اِن الفاظ میں اُگل دیا گیا ہے۔ جس عنصر کا ذہن اس عبارت میں منعکس ہو رہا ہے اس کے ذہنی افلاس کا پورا پورا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ شان تنہا اسی عبارت کی نہیں ہے، گذشتہ سات سال میں اسلامی فکر کے خلاف حضراتِ متجددین نے جتنی لڑائی بھی لڑی ہے اسی طرح کے اوچھے ہتھیاروں سے لڑی ہے۔ وہ ہمیشہ دلائل کے مقابلے میں تند جذباتیت لے کے آئے ہیں اور ان کی تند جذباتیت کا سامنا مقہور و مغضوب ملا نے جب بھی کیا ہے مُسکت استدلال سے کیا ہے فکری

کشمکش کے ان چند سالوں میں متجددین کی عقلیت کی ساکھ پوری طرح ختم ہو گئی ہے۔ عقل و استدلال کے اسی دیوالیہ پن کا نتیجہ ہے کہ آج ملک کے سیاسی اسٹیج پر یہ تجدد پسند عنصر ایسے ایسے مضحکہ انگیز کھیل دکھا رہا ہے کہ اپنے نالاں ہیں اور پرائے ہنسی اڑا رہے ہیں۔

دوسری چیز جو اس عبارت کو پڑھتے ہی نمایاں ہو جاتی ہے وہ سیاسی میدان پر بلا شرکت غیرے ہمیشہ کے لیے اجارہ دارانہ قبضہ جمائے رکھنے کا حیوانی جذبہ ہے جو تجدد پسند عنصر کی ساری نفسیاتی الجھنوں کا مرکز ہے۔ قرارداد مقاصد کے پاس ہونے میں ملّاؤں کی فتح کی بُو سونگھنا، ملّا راج کے خطرے کو سر اٹھاتے دیکھنا، اس حادثے میں تجدد پسندوں کی موت کے آثار پا لینا اور پھر اس پر اضطراب دکھانا اس بات کی کھلی کھلی شہادت ہے کہ فرید جعفری صاحب پاکستان کے اقتدار کو اپنے مختصر سے عنصر کے لیے آبائی جاگیر سمجھتے ہیں۔ اس جاگیر کے حقوقِ مالکانہ میں اگر کوئی اور عنصر بھی شریک ہوتا ہے یا اس کے نظم و نسق میں کسی پہلو سے مداخلت کا حق پا لیتا ہے تو فرید جعفری صاحب کے مالکانہ اور اجارہ دارانہ جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور اس عالم اشتعال میں وہ بغیر سوچے سمجھے جو کچھ زبان پر آتا ہے کہتے چلے جاتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر یہاں اشتراکیت نظامِ زندگی پر کسی درجے میں بھی اثر انداز ہو گی تو لازماً وہ عناصر سیاسی اہمیت حاصل کریں گے جن کا کوئی ربط اشتراکی فکر سے ہو گا۔ یہاں اگر جمہوری قدریں زور پکڑیں گی تو لازماً جمہوریت پسندوں کا سیاسی وزن بڑھے گا۔ اسی طرح یہاں اگر اسلام کا کوئی جزء ــــ باوجود تعبیری اختلافات کے ــــ ہمارے دستور اور ہمارے نظامِ معاشرہ میں نمودار ہو گا تو اس کے نتیجے میں اسلام سے علمی یا سیاسی وابستگی رکھنے والے عناصر کو سیاسی لحاظ سے کچھ نہ کچھ قوت حاصل ہو کے رہے گی۔ لیکن فرید جعفری صاحب کا ذہن اس عبارت میں بول بول کر یہ کہہ رہا ہے کہ اگر اسلام کے آنے سے ہمارے ہوتے ہوئے کسی دوسرے عنصر کو کوئی اہمیت حاصل ہوتی ہے تو پھر اسلام کو سات سلام! ملک اسلام کا کتنا ہی طلبگار ہو، ہماری ملّی تاریخ اسے بطورِ نظام اپنانے کے لیے کتنا ہی زور لگائے، قوم کو اس سے فلاح و بہبود کی کتنی ہی توقعات ہوں، عوام کا اجتماعی ارادہ اسے کتنی ہی والہانہ عقیدت کے ساتھ بُلا رہا ہو لیکن وہ اگر فرید جعفری صاحب اور ان کے ہم مفاد لوگوں کے خدائی حقوق کو متزلزل کر دے تو وہ لڑ مریں گے لیکن اسے زندگی کے دروازے سے کبھی داخل

نہ ہونے دیں گے۔ یہ وہ ذہنیت ہے جو تقریباً تمام کے تمام متجددین میں یکساں کارفرما ہے جو کبھی ادھر سے، کبھی اُدھر سے اسلام کے دستوری و سیاسی تصورات میں ٹیڑھ نکالتے رہتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنی جھنجھلاہٹ کا زور ملّا پر صرف کرتے رہتے ہیں۔ اِس ذہنیت سے کسی استدلالی مواد کی توقع نہیں کی جا سکتی بلکہ اس کا ظہور ہمیشہ جذباتی اُبال ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے جذباتی اُبال کا ردِ عمل عوام میں بھی جذباتی انداز سے رُونما ہوتا ہے۔ تاہم ہمارا مقام ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس طرح کے جذباتی ابال کے جواب میں بھی عقلیت اور استدلال سے کام لے کر فرید جعفری صاحب کو اپنے طرزِ فکر پر تحقیقی انداز سے نظرِ ثانی کی دعوت دیں۔

قائد اعظم پر بے جا تنقید قائد اعظم کا نام اِن حلقوں میں جن جا و بے جا طریقوں سے استعمال ہوتا رہا اس کے مقابلے میں آپ یہ نیا انداز دیکھ رہے ہیں کہ اب مرحوم کی غلطیاں پکڑی جانے لگی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ جس شے کو قائد اعظم کا گناہ قرار دیا جا رہا ہے وہی قائد اعظم کا عظیم ترین کارنامہ ہے۔ ایک باکمال لیڈر جب کوئی تحریک لے کے اُٹھتا ہے تو وہ ہمیشہ اپنی حکمت و بصیرت سے ایسی تدبیریں نکالتا ہے کہ ایک قوم و معاشرہ کے گوناگوں عناصر کو وہ کسی ایک مرکزی نقطہ پر جمع کر کے ساتھ لے سکے اور آہستہ آہستہ ایک متحدہ محاذ اپنے نصب العین کے حق میں پیدا کر دے۔ تاریخی کارنامے وہی لیڈر سر انجام دے سکتے ہیں جو یہ تقاضا پورا کر لے جائیں۔ اور زمانہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ قائد اعظم نے یہ تقاضا پورا کر دیا اور اس سے وہ نتیجہ رونما ہو گیا جو پیشِ نظر تھا۔ ہمارے معاشرہ میں ایک طرف انگریزی امپیریلزم کی زنجیروں سے نجات پانے کا داعیہ کارفرما تھا، دوسری طرف ہندوستانی متحدہ قومیت کے دام سے بچ نکلنے کی تڑپ موجود تھی، تیسری طرف اسلامی اصولوں پر زندگی کی تعمیرِ نو کا ولولہ دلوں میں اٹھنے لگا تھا۔ معاشرہ کے ان سارے داعیات و رجحانات کو قائد اعظم نے ایک ہی تحریک ـــــ تحریکِ پاکستان ـــــ میں جمع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف سے جدید عناصر آگے بڑھے، دوسری طرف سے دینی عناصر نے لبیک کہی اور وہ متحدہ طاقت وجود میں آئی جس نے چند سال میں زمین کے نقشے پر ایک نئی مملکت کا اضافہ کر دیا۔ بلکہ فرید جعفری صاحب کو ہم یہ یاد دلانا چاہتے ہیں کہ جب تک قائد اعظم تنہا جدید عنصر کو

ساتھ لے کر چل رہے تھے مسلم لیگ ایک غیر اہم وجود کی حیثیت سے دن گذار رہی تھی، یہ تحریک پاکستان کی صورت میں عوامی طاقت اس روز بن سکی جس روز جدید عنصر کے ساتھ دینی عنصر بھی آ ملا۔ قائد اعظم کی اس "غلطی" سے برسر اقتدار طبقے نے جونہی توبہ فرمالی اور دینی عناصر کے خلاف کشمکش کا آغاز فرما دیا اسی لمحے مسلم لیگ کا زوال بھی شروع ہوگیا اور برسر اقتدار طبقے کی عوامی مقبولیت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ قائد اعظم کے کیے کرائے کو اب آپ حضرات غارت کرنے پر تُل گئے ہیں اور متحدہ قومی طاقت کا شیرازہ درہم برہم ہونے لگا ہے۔ قائد اعظم کے طرزِ فکر کی روشنی میں خان لیاقت علی خاں مرحوم نے قرار داد مقاصد پاس کرائی اور اس کے ذریعے قوم کی طاقتوں کو جمع رکھنے کی سعی کی۔ چنانچہ یہ سعی بڑی حد تک کامیاب رہی۔ اب جبکہ خان لیاقت علی خاں کا سینہ ایک ظالم کی گولی نے چھلنی کر دیا، لوگوں کو یہ توفیق مل گئی ہے کہ وہ اس کے یادگار تاریخی کارنامے ـــ قراردادِ مقاصد ـــ میں چھید کریں۔

بتایا گیا ہے کہ قائد اعظم نے مذہبی لوگوں پر بے جا طور پر کچھ مراحم خسروانہ فرما دیئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ مراحم خسروانہ کونسے ہیں جن کو دیکھ کر کسی کے سینے پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔ قائد اعظم نے کونسے مناصب مذہبی لوگوں میں بانٹ دیے تھے؟ کتنی ایک وزارتیں ان کو دے دی تھیں؟ کتنے ایک وظائف ان کے نام جاری فرما دیے تھے؟ کونسی جاگیریں ان کے نام لکھوا دی تھیں؟ ہمارے علم کے مطابق تو قائد اعظم نے یہ سارا خوان یغما جدید طبقے میں لٹوایا تھا۔ مذہبی لوگوں کو کیا ملا؟ صرف یہ کہ ایک مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو ساتھ رکھا؛ اور وہ بھی اس حد تک کہ مولانا عثمانی ایک فقیرانہ بے بسی کے عالم میں دن گذار گئے۔

مگر فرید جعفری صاحب کا ذہن مذکورہ بالا عبارت میں جس شان سے جلوہ گر ہے اس سے یہ بات ٹپکتی ہے کہ قائد اعظم نے دینی عناصر کو پوری طرح ٹھکرایا اور کچلا کیوں نہیں، جینا کیوں چھوڑ دیا! ان کی رائے کے لحاظ سے چاہیے یہ تھا کہ قائد اعظم تحریک کے انتہائی مشکل اور ادق مراحل میں علماء اور دینی عناصر سے کام لیتے، ان کو خوب استعمال کرتے، پھر جب کامیابی ہو جاتی تو خانہ جنگی کا خطرہ مول لے کر بھی ان کو صاف صاف طریق سے دھتا بتا دیتے اور اس قابل چھوڑ کر عالم فانی سے رخصت نہ ہوتے کہ وہ پاکستان کے پچھلے برسے کے متعلق کبھی زبان کھول سکیں لیکن فرید جعفری صاحب، کو قائد اعظم جیسی اونچی شخصیت سے

اس میکیاویلیانہ عیاری کی توقع کرنے کی گنجائش کہاں سے ملی!

پھر سوال یہ بھی ہے کہ آخر متجددین نے پاکستان کے مسلم معاشرہ کا جو نقشہ ذہن میں بنا رکھا ہے کیا اس میں وہ خود برہمن بن کے بیٹھنا چاہتے ہیں اور دینی عناصر کو اچھوت بنا کے رکھنا چاہتے ہیں؟ وہ کیا چیز ہے جسے پس منظر میں رکھتے ہوئے وہ یہاں ایک عیسائی، ایک ہندو، ایک ملحد، ایک موچی، ایک جولاہے کو تو حق دے سکتے ہیں کہ وہ اپنے سیاسی حقوق کا استعمال کرے، لیکن ہر وہ شخص جو اسلام کا علم حاصل کرے یا اس پر عمل کرنے کا قصوروار ہو جائے اسے وہ "ملا" قرار دے کر سرے سے سیاسی حقوق سے محروم کر دینا چاہتے ہیں؟ ہر کوئی بول سکتا ہے مگر ایک اسلامی نظام کا خواستگار دم مارنے کا حق نہیں رکھتا؟ اس کے لیے کونسی منطق آپ کے پاس ہے۔ کونسا سیاسی نظریہ ہے جسے آپ مدارِ فکر بناتے ہیں؟

ہم عرض کریں گے کہ دینی عناصر کو جو سیاسی اہمیت اپنے معاشرہ میں حاصل ہے وہ کسی کا عطیہ نہیں ہے، وہ کوئی خیرات نہیں ہے جو کسی منعم کی طرف سے اُن کی جھولی میں ڈالی گئی ہو، بلکہ یہ سب کچھ نتیجہ ہے اُن کے اُس پارٹ کا جو وہ اپنی قوم کی بہبود کے لیے فکر و عمل کے میدان میں ادا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ نہ کسی کا عطیہ تھا، نہ اسے کوئی ان عناصر سے واپس سلب کر سکتا ہے۔ آج دینی عناصر کو "ملائیت" کے القاب دینے والا ذہن ایک طرف بے تحاشا گالیوں کی بوچھاڑ کر رہا ہے، دوسری طرف نظربندی، زبان بندی، قید اور پھانسی کی سزاؤں سے ان کو نوازا جا رہا ہے۔ لیکن یہ چیزیں اُلٹا ان کی سیاسی قدروقیمت میں اضافہ کر رہی ہیں۔ آج پاکستان کا سارا کا سارا جدید عنصر جاہ و منصب کی جاگیر کے بٹوارے میں باہم دست بگریباں ہے اور ایک "ملا" ہے جو اپنی مخلصانہ دعوت اور اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے سچے جذبے میں سرشار قید و بند کے امتحانوں سے گذر رہا ہے۔ تخت پر بیٹھ کر مفاد کی پوجا کرنے والوں اور تختے پر کھڑے ہو کر حق کی صدا بلند کرنے والوں کا یہ فرق خود بخود ایک طاقت کو پستی کی طرف سے جا رہا ہے اور دوسری طاقت کو سیاسی اہمیت سے آراستہ کر رہا ہے۔ اس پوزیشن میں ہوتے ہوئے آپ غصے میں قائد اعظم کی قبر کی مٹی اکھیڑ کر نہ دینی عناصر کو اس کے مقام سے نیچے لا سکتے ہیں، نہ اپنا مرتبہ بڑھا سکتے ہیں۔

دینی عناصر کی جو کچھ قدر و قیمت بھی بنی ہے وہ درباروں میں نہیں، رائے عام کے میدان میں بنی ہے وہ تحریکِ آزادی کے دوران میں بھی، تحریکِ پاکستان کے دوران میں بھی اور اب دستوری جدوجہد کے دوران میں بھی تمام عوامی طبقوں میں پہنچے ہیں، انہوں نے لوگوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو سنا اور لوگوں کے جذبوں کو سمجھا ہے، انہوں نے رُو در رُو ہو کر اپنا پیغام پہنچایا ہے۔ انہوں نے لوگوں کے سامنے اپنے دلائل رکھے ہیں، وہ اپنے عوام میں گھُلے ملے ہیں، ان کے شانہ بشانہ ہو کر چلے ہیں، اس فطری اور جمہوری طریق پر ان کو سیاسی وزن حاصل ہوا ہے۔ اخباری مقالوں میں جوش دکھا کر کون اس وزن کو ختم کر سکتا ہے!

ملاکریسی کا کوئی جرثومہ ہے کہاں؟ بظاہر اس عبارت کو پڑھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے سے (خصوصاً اس میں لفظِ سنّت شامل ہونے کی صورت میں) علماء بہ حیثیتِ طبقہ ہماری سیاسی ہیئتِ تعمیر میں کوئی جگہ حاصل کر گئے ہیں۔ گویا کوئی مسلم کلیسیا موجود تھا جس نے اسٹیٹ کے نظامِ عمل میں ایک انسٹی ٹیوشن کے طور پر دخل حاصل کر لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر صورتِ واقعہ یہی ہو تو متجددین سے زیادہ اس میں اسلام کے خیر خواہوں کے لیے وجہِ اضطراب موجود ہے۔ اور اس صورت میں ہم متجددین کا جائز حق یہ مان لیں گے کہ وہ ہر اسلام پسند کو "ملّا" اور "ملاازم" سے زیادہ کریہہ لفظوں میں گالی دیں۔ لیکن یہ ایک عجیب عالم ہے کہ جو شے واقعہ میں موجود نہیں ہے، اسے پروپیگنڈہ سے موجود قرار دے کر اور اسے اپنے مبغوض عنصر سے منسوب کر کے پھر اس کے خلاف دل کا بخار نکالا جاتا ہے۔

قراردادِ مقاصد کے بیج سے جو دستوری نقشہ نمودار ہوا ہے اس میں کہیں خوردبین لگا کر دیکھنے سے بھی کوئی جرثومہ کسی مذہبی طبقے کی فرمانروائی کا دکھائی دیتا ہے؟ وہ چیز جسے فرید جعفری صاحب ملاکریسی (MULLAHCRACY) کی جدید اصطلاح سے موسوم فرما رہے ہیں، کہیں اس کا کوئی ہیولیٰ پیشِ نظر مسودۂ دستور میں یا کسی دینی جماعت کے مطالبہ و منشور میں پایا جاتا ہے؟ جہاں عوام کو آزادانہ طور پر اپنے نمائندے منتخب کر کے ان کے ذریعے حکومت خود اختیاری (SELF GOVT) چلانے کا کھلا کھلا موقع

دیا جا رہا ہو اور جہاں ہر آنے والے کو رائے عام کی رضامندی ہی سے آنے کا موقع ملے اور جہاں کسی طبقے کے طبقاتی حقوق کو دستوری نقشے میں شامل نہ کیا گیا ہو، وہاں ملاکریسی کا ہوا خیال ہی خیال میں دیکھ کر چونک جانا اور اس پر شور مچا دینا کونسی معقولیت ہے! اور تو اور، بنیادی اصولوں کی رپورٹ میں "ملا بورڈ" کی جو تجویز رکھی گئی تھی اس کے خلاف آواز اٹھانے میں سب سے پیش پیش جماعتِ اسلامی تھی جو علماء کی ایک نمائندہ مجلس کے ترمیمی فیصلوں کی ترجمانی کر رہی تھی! آخر فرید جعفری صاحب بتائیں تو سہی کہ اس بچارے لفظ سنت کے اندر سے ملاکریسی کا فتنہ کس طرف سے ابھرتا دکھائی دیتا ہے؟

ہاں اگر تشویش اس بات کی ہو کہ پاکستان میں کسی درجے میں بھی اسلامی نظام کے قیام کی صورت میں دینی عناصر کی وقعت خود رائے عام کے دائرے میں بڑھ جائے گی اور دینی رجحانات پبلک حلقوں میں زور پکڑ لیں گے اور اس کے نتیجے میں آہستہ آہستہ موجودہ توازنِ قوت بدلے گا اور اس کا اثر آج کی برسرِ اقتدار طاقت پر یک دم نہیں تو تدریجاً ضرور پڑ جائیگا تو اس کی گنجائش ہے لیکن یہ اندیشہ لفظ سنت کا مرہونِ منت نہیں، بلکہ اگر صرف قرآن یا اسلام کا نام بھی کہیں باقی رہے گا تو اس صورت میں بھی اس اندیشے سے نجات نہ ہو سکے گی۔ سنت کی تعبیر سے پیچھے ہٹ کر آپ معاملہ اگر قرآن کے احکام کی تعبیر پر بھی لے جائیں تو بھی اُن لوگوں کو اولیت دیے بغیر چارہ نہیں جو قرآن کا تحقیقی علم رکھتے ہوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ نہ قرآن کا علم حاصل کرنے کا اجارہ کسی طبقے کو حاصل ہے، نہ اُس پر دادِ تحقیق دینا اور اس کی تعبیر کرنا کوئی موروثی پیشہ ہے، بلکہ ہر شخص کے لیے میدان کھلا ہے اور یہ حق جمہوری ہے۔ لیکن جو لوگ اس میدان میں عمریں کھپاتے ہیں اور کاوشیں کرتے ہیں ان کو اگر کسی تعصب کی وجہ سے پیچھے دھکیل کر نا اہل لوگوں کو تعبیرِ احکام کی ذمہ داری سونپ دی جائے تو قرآن کی حکمت و قانون کا ایک ایک جزء مضحکہ بن کے رہ جائے گا۔ ایک مثال کے طور پر مروجہ قانون کو لے لیجیے۔ اس قانون میں علم و تحقیق کرنا کسی طبقے کے لیے مخصوص نہیں، بلکہ ہر فرد کو حق ہے کہ جائے اور محنت و کاوش سے اس میدان میں اپنا کوئی مرتبہ پیدا کرے۔ چنانچہ اس قانون کی تعبیر کا حق انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جنہوں نے اس خدمت کے لیے پوری طرح ذہنی تیاری کی ہو۔ لیکن فرض کیجیے کہ کل ایک اخبار نویس یا ایک سیاسی لیڈر تعزیراتِ پاکستان کی

مدد گردانی کرے یا پاکستان کے دستوری قانون کا ترجمہ پڑھ کر، بلکہ یوں کہیے کہ اتنی مشقت بھی اٹھائے بغیر یہ دعویٰ کرے کہ چونکہ قانون کی تعبیر کرنا کسی طبقے کے لیے خاص نہیں، لہٰذا میں ججوں یا وکیلوں، یا قانونی محققین کی پوزیشن میں بات کرنے کا حقدار ہو گیا ہوں۔ اور اگر میرا یہ حق نہیں مانا جاتا تو یہاں لایر کریسی (LAWYERCRACY) قائم ہو گئی ہے۔ تو فرمائیے کہ اس کے ذہنی توازن کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کریں گے؟ آپ کہیں گے کہ وہ سر پھرا ہے۔ وہ اگر سر پھرا ہے تو کیا اس شخص کا دماغ صحت مند ہو گا جو یہ چاہے کہ قرآنی حکمت و قانون پر جو نظامِ زندگی چلے اس میں اہلِ علم اور بے علم لوگوں کو یکساں حقِ تعبیر حاصل ہو! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ نہ قانون کے دائرے میں یہ ممکن ہے، نہ رائے عام کے سیاسی دائرے میں!

دینی عناصر کی اہمیت بڑھنے کے اندیشے کا سدِ باب محض لفظ "سنت" کو قلم زن کرنے سے نہیں ہو سکتا، سرے سے اسلام ہی کا اڈا اڑانا پڑے گا۔

تفرقہ کا سبب مفاد پرستی ہوتی ہے غیر صحت مندانہ اختلافات، یا دوسرے لفظوں میں فرقہ وارانہ اور متعصبانہ جھگڑے زندگی کے جس بھی گوشے میں پیدا ہوتے ہیں، ذہنیتوں کے فساد سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بڑے گہرے اسباب ہوتے ہیں جن کا تعلق انفرادی اور اجتماعی نفسیات سے بھی اور معاشرہ کی اخلاقی حالت سے بھی ہے۔ لیکن ان کی اصل جڑ ہمیشہ "بَغْيًا بَيْنَهُم" ہوتی ہے۔ قرآن کے ان الفاظ میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے وہ سادہ لفظوں میں یہ ہے کہ جب اجتماعی سرگرمیوں اور تمدنی مسائل میں کسی گروہ کے سامنے سے اصولِ اساسی اور نصب العین حق کی اہمیت ہٹ جاتی ہے اور مفاد بیچ میں آکودتا ہے، اور اسی طرح علمی و فکری بحثوں میں جب جستجوئے حق کے بجائے گروہی مصلحت اہمیت اختیار کر جاتی ہے تو غیر صحت مندانہ اختلافات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ چاہے کوئی قوم سرے سے اسلام یا کسی اور مذہب کو مانتی اور جانتی بھی نہ ہو تو بھی یہ قانون اس کے اندر ٹھیک اسی طرح اپنا کام کرے گا جیسے وہ آپ کو مسلمانوں کے اندر کام کرتا ملتا ہے۔ اسی طرح کوئی گروہ جو سنت کا قطعی منکر ہو، وہ بھی اس قانون کی زد میں اسی طرح آئے گا جس طرح اپنی قوم کا حال

آپ دیکھتے ہیں۔ بلکہ دور کیوں جائیے، ذرا اپنی "واحد نمائندہ" سیاسی جماعت کا حال دیکھ لیجیے، اور پھر بھی اگر تسلی نہ ہو تو پورے کے پورے برسر اقتدار طبقے پر نگاہ ڈال کر ایک ایک شخص اور گروپ کے ہفت سالہ دور کا مطالعہ کیجیے۔ تخرب کی جو عجیب و غریب مثالیں سامنے آئیں گی، سازشی کارروائیوں کے جو عبرتناک نمونے آپ کی نظر سے گذریں گے، جوڑ توڑ کے جو حیرت انگیز شعبدے آپ کے ملاحظہ میں آئیں گے، کرسیوں کے ٹکرانے کے جو شرمناک مناظر تاریخ پاکستان کو منور کرتے ملیں گے، یہ سب کچھ سنت اور سنت پر ایمان رکھنے والوں کی برکات نہیں ہیں، خالص متجددین کے زریں کارنامے ہیں۔ ان زریں کارناموں نے اس ملک کو آج شخصی آمریت، فوجی ڈکٹیٹر شپ اور لادستوریت کے مہلک خطرات سے دوچار کرکے دنیا بھر میں اس کی ساکھ اجاڑ دی ہے۔ آپ جب ٹھنڈے دل سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہاں بھی وہی الٰہی قانون کام کر رہا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس قانون کا عمل جیسا دین کو ماننے کی صورت میں ہوتا ہے ویسا ہی لادینی کی صورت میں بھی ہوتا ہے، اور اس کا اثر جس طرح سنت کے دائرے میں پڑ سکتا ہے، ویسا ہی قرآن پر پڑ سکتا ہے۔ شاید آپ کے علم میں ہوگا کہ ہمارے ہاں ایک بڑا فرقہ ایسا پایا جاتا ہے جو سرے سے موجودہ قرآن ہی کو ناقابل اعتماد ٹھہراتا ہے اور اس کو محرَّف گردانتا ہے۔ "بغیاً بینہم" کی بلانے اس گروہ کو دوسروں کے ساتھ ایک قرآن پر بھی جمع ہونے کے قابل نہ چھوڑا۔ اصول کے بجائے جب مفاد آگے آجاتا ہے اور ایمان کے بجائے تعصب کام کرنے لگتا ہے تو پھر سنت تو کیا، لوگ ایک خدا پر بھی متفق نہیں رہ سکتے۔ ہماری تاریخ ہو یا بنی اسرائیل کی، یا دوسری گذشتہ و موجودہ اقوام کی، جسے بھی آپ ملاحظہ فرمائیں گے اس میں یہی "بغی"، یا دوسرے لفظوں میں مفاد پرستی اور تعصب زدگی آپ کو فرقہ بندیاں پیدا کرتی دکھائی دے گی۔ اس "بغی" کے کرشموں کو اٹھا کر "سنت" کے انسٹی ٹیوشن کے سر تھوپ دینا ایک ایسی مضحکہ انگیز حرکت ہے جس پر ہر معقولیت پسند آدمی سر دھنتا رہ جائے گا۔ اگر متجددین کی اندھی منطق اس اسلوب پر کام کرتی ہے تو کچھ بعید نہیں کہ کل آپ یہ ادعا بھی کریں کہ پنجاب اور مشرقی پاکستان کے سیلاب اور کوئٹہ کے زلزلے کا اصل سبب بھی سنت اور ملّا ازم اور زر اور دادِ مفاسد ہے! اس نو ایجاد

پاکستانی منطق کا توڑ کس کے پاس ہوگا!

اشتراکیت اور ملاازم کا موازنہ "ملاازم بھی اتنا ہی خطرناک ہوگیا جتنا کہ اشتراکیت تھی"!

کیا آپ نے یہ لکھتے ہوئے سوچا بھی کہ اشتراکیت کیوں خطرناک ہے اور پاکستان کا مسلمان اسے کیوں اپنے حق میں ایک تباہ کن مصیبت سمجھتا ہے؟ یہ جملہ یہی غمازی کرتا ہے کہ غور و فکر سے کام نہیں لیا گیا۔ اگر ناگوار نہ ہو تو ہم عرض کردیں۔

پہلی چیز جس کی وجہ سے پاکستان کا فاقہ کش دہقان اور مظلوم مزدور اشتراکیت کے ہاتھ سے روٹی لے کر کھانے سے بچنا چاہتا ہے یہ ہے کہ اس روٹی کی قیمت میں اسے اپنا دین و ایمان، اپنی ملی روایات، اپنی تاریخ، اپنا کلچر سب کچھ دینا پڑتا ہے۔ ہمارے غریب طبقے مادہ پرستی کے اُس زہر سے بچنے کے لیے فاقہ کشی کے استبداد اور سرمایہ دار طبقے کے مظالم سے صبر و تحمل کے ساتھ گذر رہے ہیں جو اشتراکی فلسفے کے تنور میں پکی ہوئی روٹی میں ملا ہوا ہے۔ وہی قرآن و حدیث کہ جن کے خلاف آپ حضرات پیچ و تاب دکھا رہے ہیں، ان غریب طبقوں کا سرمایہ ایمان ہیں اور وہی کتاب و سنت کے الفاظ جن سے آپ کو چڑ ہے، آپ کے ہزاروں بھائیوں کے لیے ایک انمول خزانہ تسکین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عمل کی دنیا میں تو آپ نے ان کو ایک تنکا بھی نہیں دیا، کاغذی دنیا میں آپ نے ان کی جھولی میں ابھی صرف یہ دو لفظ ہی ڈالے تھے، لیکن اس داد و دہش پر بھی آپ کو اب پشیمانی ہو رہی ہے اور یہ الفاظ بھی واپس چھیننے کے درپے ہیں۔ لیکن غلط فہمی نہ ہو، یہ آپ کی داد و دہش نہیں، یہ قوم کی روح کی اپنی پکار ہے جس کی گونج قرارداد مقاصد میں سنائی دے رہی ہے اور اس گونج کو اب کوئی ختم نہیں کرسکتا۔ کیا سنت کا علمبردار ملاازم بھی اشتراکیت کی طرح ان کو مادہ پرستی اور الحاد کے جہنم میں جھونکنا چاہتا ہے کہ آپ نے دونوں کی خطرناکی میں مشابہت پیدا کردی؟ بخلاف اس کے سنت سے کد رکھنے والوں کا گروہ ایک ایسا گروہ ہے جو ہمارے عوام کا معاشی مسئلہ تو حل کر کے نہیں دیتا، البتہ مفت میں مادہ پرستی اور الحاد کے جہنم میں جھونک دینے پر تلا ہوا ہے۔

دوسری چیز جو ہمارے عوام کو اشتراکیت سے متنفر کرتی ہے وہ ہماری پالیسی پر باہر کے ایک ملک

کے اثر انداز ہونے کا واضح خطرہ ہے۔ اشتراکیت جہاں پر تو ڈالتی ہے وہاں ایک طرف اس دین معاشی کی ارض مقدس اور اس کے قبلہ و کعبہ کا ذہنی تسلط قائم ہو جاتا ہے اور وہ فکری لحاظ سے چشمۂ ہدایت قرار پاتا ہے، دوسری طرف ملکی اور بین الاقوامی پالیسی کی باگ ڈور ایک بیرونی طاقت کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔ فرید جعفری صاحب ذرا ارشاد فرمائیں کہ کیا ملاازم بھی پاکستان کے عوام کو کسی خارجی طاقت کے ذہنی اور سیاسی تسلط میں دینا چاہتا ہے؟ — اس کا جواب وہ اثبات میں جبھی دے سکتے ہیں کہ وہ خدا اور رسول کو بھی ایک خارجی طاقت (FOREIGN-POWER) قرار دیں! ناگوار خاطر نہ ہو تو ہماری ناقص رائے یہ ہے کہ بدنام روزگار "ملاازم" کی کوششوں کے خلاف یہ متجددین ہی ہیں جو پاکستان کو ذہنی لحاظ سے بیرونی طاقتوں کے قدموں میں ڈال دینا چاہتے ہیں اور سیاسی و معاشی حیثیت سے اسے کسی نہ کسی کے گھڑے کی مچھلی بنا کے رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے یہ مماثلت بھی اشتراکی خطرے سے اگر ہو سکتی ہے تو مخالفِ دین حضرات کی روش میں ہو سکتی ہے۔ اس طرح کا اندیشہ ملاازم سے کیسے وابستہ کیا جا سکتا ہے!

تیسری چیز جو اہلِ پاکستان کو اشتراکیت سے دُور ہٹانے والی ہے وہ اس کی انقلابی ٹکنیک ہے۔ اشتراکیت تبدیلی پیدا کرنے کے لیے غیر ملکی ساز باز کے ساتھ ساتھ توڑ پھوڑ کا جو مہلک طوفان بپا کرنے پر فطرتاً مجبور ہے، پاکستان کے لوگ اپنی نوخیز مملکت اور اپنی ملی ہیئت کو اس کی موجوں کا شکار ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ پاکستان کے دینی عناصر سے اس انقلابی ٹکنیک کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ وہ نہ غیر ملکی ساز باز کا مزاج رکھتے ہیں، نہ سازشی اسلوب ان کو اپیل کر سکتا ہے، نہ خفیہ طرزِ تحریک اُن کے دینی رجحانات سے میل رکھتا ہے اور نہ غیر آئینی توڑ پھوڑ کو ان کے ذوق سے مناسبت ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکے کہ پھر "ملاازم" کو اشتراکیت جیسا خطرہ کس بنا پر کہا گیا ہے۔ البتہ اس لحاظ سے بھی ملک کو مارشل لاء اور فوجی حکومت اور ۹۲ الف اور آمریت کے مصائب میں مبتلا کر کے متجددین ہی ایک ایسا خطرہ ثابت ہو رہے ہیں جن کو کسی نہ کسی درجے میں اشتراکی خطرے کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔

آخر میں ایک پہلو اور رہ جاتا ہے جس کا جائزہ ہمیں لینا چاہیے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ موجودہ برسرِ اقتدار

اصحاب کا گروہ اشتراکیت کو غالباً اس لحاظ سے سب سے بڑا خطرہ سمجھتا ہو کہ یہ بلا اگر آوارد ہو تو یہ ان کی مسندوں کو ضرور متزلزل کر ڈالے گی یہی وہ پہلو ہے جس کے زاویہ سے یہ گروہ جب دینی عناصر کی اٹھان کو دیکھتا ہے تو ادھر بھی اسے وہی خطرہ دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ اشتراکیت کے خونی ہاتھ کے مقابلے میں اسلامی تحریک کا ہاتھ امن و سلامتی کا ہاتھ ہے، اشتراکی دعوتِ انقلاب کے مقابلے میں اسلامی دعوت، اصلاح کی دعوت ہے، طبقاتی کشمکش کے بیگل کے مقابلے میں یہ صرف اصولوں کی کشمکش کی نفیر ہے، فوری ادل بدل کے مطالبے کے مقابلے میں یہ تدریجی تغیّر کا تقاضا ہے، دشمنی کے جذبے کے بجائے ادھر برادرانہ خیر خواہی کا داعیہ کار فرما ہے۔ لیکن اگر اصلاح پسندانہ تدریجی تغیّر بھی ناگوار گذرے تو پھر ہر طرف خطرہ ہی خطرہ نظر آئے گا۔ اس خطرے سے نجات تو اسی صورت میں ممکن ہوگی جبکہ تاریخ کے چلتے ہوئے کاروانِ حوادث کو موجودہ حالت کے کھونٹے سے باندھ کے کھڑا کیا جاسکے۔

اب دیکھ لیجیے کہ "ملاازم" کو اشتراکیت کے مماثل ایک خطرہ قرار دیتے ہوئے فرید جعفری صاحب نے کہاں تک غور و تفکر سے کام لیا ہوگا! ہو سکتا ہے کہ انہوں نے امریکہ کی اشتراکیت دشمنی کا رُخ پاک[illegible] کے دینی رجحانات کی طرف موڑ دینے کے لیے یہ فقرہ لکھ ڈالا ہو اور ایسے کام میں دلائل کی ضرورت ہی نہ سمجھی ہو۔

بہتّر سے زائد فرقے فرید جعفری صاحب کی تازہ ریسرچ اور جدید ترین انکشاف یہ ہے کہ پاکستان میں بہتّر سے زائد فرقے پائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی اُن سے مطالبہ کرے کہ براہِ کرم ان بہتّر سے زائد فرقوں کی فہرست نمبروار اپنے اخبار میں شائع فرما دیجیے تو وہ یہ فہرست کہاں سے پوری کر کے دیں گے۔ بہتّر سے زائد تو خیر بڑی بات ہے، ہم درخواست کریں گے کہ صرف دس ہی فرقوں کے نام شائع فرما دیجیے جو پاکستان کی اجتماعی ہیئت کے بارے میں سنت کی مختلف تعبیرات ساتھ لیے میدانِ عمل میں نمایاں ہوں، بجز اس کے کہ وہ ہر اختلاف کو ایک نئے فرقے کی اساس مان کر اکّے دکّے افراد اور ناقابلِ ذکر ٹولیوں کی گنتی گن ڈالیں، — جیسے کہ وہ اپنے آپ کو ایک فرقہ قرار دے لیں — اور کسی صورت وہ دس فرقوں کی تعداد بھی پوری نہیں کر سکتے۔ بڑے بڑے فرقے جن میں بنیادی اختلافات موجود ہیں

دو ہی ہیں :- ایک اہل سنت والجماعت ، دوسرے شیعہ حضرات! ان کے اندر جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ محض مدارس فکر کے اختلافات ہیں جن کی وجہ سے مستقل فرقے نہیں پیدا ہوتے ۔ اس تعداد کو پیش کرنے کے لیے بڑے سے بڑے مبالغہ سے بھی کام لیا جائے تو بھی اس میں ستر کا اضافہ کر دینا بہت بڑی شاعری ہے ۔

لیکن یہ دو یا بہتر سے زائد فرقے جن کے اختلافات کا ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر آپ سنت کو بدنام کرنا چاہتے ہیں ان کی اتحاد پسندی اور معقولیت کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے صدیوں کے اختلافات کو تہ کر کے جنوری ۱۹۵۱ء میں بمقام کراچی جمع ہو کر دو تین روز کے تبادلۂ خیالات سے ایک ہی تعبیر سنت پر اتفاق کر لیا تھا اور پاکستان کی اجتماعی ہیئت کے متعلق ۲۲ متفقہ اصول طے کر کے منتشر ہو گئے ۔ آپ کے متجددین سیٹوں کے بٹوارے پر ایک مرتبہ لڑے ، دوسری مرتبہ لڑے ، پھر تیسری مرتبہ "ایک یونٹ" کے مسئلے پر باہم دگر روٹھ کر منتشر ہو گئے اور ان کی باہمی پھوٹ کی وجہ سے مسودۂ دستور تو کیا خود دستور یہ کا وجود خطرے میں پڑ گیا ۔ اور ملک ایک عجیب ہنگامی صورت سے دوچار ہو گیا ۔ آخر آپ ارشاد تو فرمائیے ، کس دستوری نکتے پر ، کس سیاسی مسئلے پر اور کس ملکی قضیے پر آپ نے قرآن و سنت کی مختلف تعبیرات کرنے والے بہتر فرقوں کو لڑتے دیکھا ہے ۔ کسی کے خلاف الزام عاید کرنے سے قبل ضروری معلوماتی مواد تو فراہم کر لینا چاہیے تھا اور پہلے اپنی جگہ اس کا جائزہ لے لینا چاہیے تھا ۔

سنت اور جمہوریت سنت کے انسٹی ٹیوشن کے خلاف آپ کا ایک الزام یہ ہے کہ اس نے اسلام کے ابتدائی جمہوری نظام میں بگاڑ پیدا کیا ۔ اس تحقیق انیق کا سرچشمہ کیا ہے ؟ اس کے لیے آپ نے کیا تاریخی مواد اور کیا استدلالی مسالہ جمع کیا ہے ؟ افسوس ہے آپ نے پوری عبارت میں اس طرح کا جو دعویٰ بھی کیا ہے اس پر دلیل کہیں ایک بھی پیش نہیں کی ۔

یہ بات علمی اور تاریخی حیثیت سے ثابت شدہ ہے اور اس کی تردید کرنے کی جسارت کوئی نہیں کر سکتا کہ خلفائے راشدین نے اجتماعی نظام کو قرآن کے ساتھ ساتھ سنت کی بنیاد پر چلایا ہے ۔ اس کے ساتھ یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ خلافت راشدہ کے پورے دور میں اسلامی جمہوریت کے تمام لوازم ، مثلاً

آزادیٔ رائے، حق تنقید، رائے عام کا احترام، عدلیہ کی آزادی اور شورائیت پوری طرح کارفرما رہے۔ خلافت راشدہ کے بعد اسلامی جمہوریت اگر شخصی بادشاہت میں بدلی ہے تو بنوامیہ کے ان سلاطین کے ہاتھوں بدلی ہے جنہوں نے نہ صرف سنت سے، بلکہ خود قرآن سے انحراف کیا۔ موروثی اقتدار کا کوئی تصور نہ سنت نبوی میں ملتا ہے، نہ سنت خلفائے راشدین میں۔ رسول اللہ صلعم جب واصل بحق ہوئے تو آپ نے کسی بیٹے بھتیجے کو گدی نہیں سونپی، بلکہ امت میں جو ہستی (FIGURE) نمایاں ترین مرتبہ رکھتی تھی اسے لوگوں نے منتخب کر لیا۔ پھر خلیفۂ اول کا دم آخر آپہنچا تو شورائیت کے اصول پر اہل الرائے سے مشورہ کر کے آپ نے اپنے بیٹے اور دوسرے عزیزوں کو چھوڑ کر ایک ایسے بہترین رفیق مقصد کو نامزد فرمایا جسے رائے عام نے پسندیدگی کے ساتھ قبول کیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے دنیا پر نگاہِ واپسیں ڈالتے وقت اپنے بیٹے کو نامزد کرنے کے بجائے ایک خاص کمیٹی اپنے جانشین کے تقرر کے لیے مامور کی۔ اس نے رائے عام کو اتنا کھنگال کر حضرت عثمانؓ کا تقرر کیا کہ اس دور کے لحاظ سے ہم اسے اچھا خاصا انتخاب قرار دے سکتے ہیں۔ سب سے آخر میں حضرت علیؓ کا انتخاب اگرچہ ہنگامی حالات کے آثار چڑھاؤ میں ہونے کی وجہ سے ایک مختلف نوعیت رکھتا ہے، لیکن بہرحال موروثی اقتدار کے نظریے کے بجائے امت کے عمومی اقتدار کے نظریے ہی کے تحت ہوا۔ یہ تھی سنت نبوی اور سنت خلفائے راشدین! اس دور کے مقابلے میں امویوں اور عباسیوں اور فاطمیوں کے دور جہاں بھی اسلامی جمہوریت و شورائیت سے ہٹتے ہوئے ملتے ہیں وہاں قصور سنت کا نہیں، نتیجہ ترکِ سنت کا ہے! بادشاہوں کا اپنے بیٹوں کو ولی عہد بنانا، جانشینوں کو نامزد کرنا، ان کے لیے پیشگی بیعت لینا، پھر ہر تخت نشین ہونے والے کا اپنے لیے جبری بیعت حاصل کرنا یہ سارے کے سارے مفاسد سنت کا دامن چھوڑ دینے کے بعد ہی اسلامی معاشرے میں پیدا ہوئے۔ ان مفاسد کے مقابلے میں صدائے حق بلند کر کے سولیوں پر چڑھنے والے، تلواروں سے ذبح ہونے والے اور کوڑے کھانے والے ائمہ و صلحاء البتہ وہ لوگ تھے جن کو آج تک حاملین سنت کہا جاتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس دیدہ دلیری سے تاریخ کی ترتیب دن دہاڑے الٹ کر ہمارے سامنے

رکھی جاتی ہے۔ جو کرتوت تارکینِ سنت کے تھے اور جمہوریت کو ذبح کرنے کا جو قصور سنت سے روگردانی کرنے والوں کا تھا اس کو اٹھا کر سنت اور حاملینِ سنت کے ذمے لگا دیا جاتا ہے۔ شاید شانِ تجدد یہی ہے کہ جو بات بھی کی جائے لاجواب کی جائے۔

ہاں! اگر منشا یہ ہو کہ سنت قوم کی آزادہ روی میں رکاوٹ ڈالنے کا موجب بنتی رہی ہے، اور فرامینِ نبوت نے جمہور کی خواہشات اور میلانات کو کھُل کھیلنے نہیں دیا تو یہ خطا تنہا سنت ہی کی نہیں ہے، اس معاملے میں قرآن نے بھی بہت کچھ کیا ہے اور کر رہا ہے۔ اگر سنت کی یہ حیثیت تھی کہ اسے پیش کر کے ایک زیرِ بحث معاملے کو کسی متعین فیصلے تک پہنچایا جا سکتا تھا تو قرآن کی آیات میں یہ انتہائی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اگر سنت اس معنی میں جمہوریت کی نقیض تھی تو قرآن اس سے کئی گنا زیادہ نقیض ہے، کیونکہ سنت میں قیل و قال کی گنجائش قرآن کے مقابلے میں بہر حال زیادہ موجود ہے۔ اب اگر مطلوب ایسی غیر محدود جمہوریت ہو جس میں آپ کے عوام اور آپ کی پارلیمنٹیں اور وزارتیں اندھا دھند جدھر چاہیں بڑھتی چلی جائیں تو پھر محض سنت سے لڑائی لڑ کے آپ نجات نہیں پا سکتے، خود قرآن کے خلاف بھی ہلّہ بولنا پڑے گا۔

الٹا نظریہ سنت کے انسٹی ٹیوشن پر ایک الزام یہ بھی لگایا گیا ہے کہ اُس نے ملت کو پارہ پارہ کر دیا۔ مگر یہ عجیب و غریب الزام امرِ واقعہ کے بالکل برعکس پڑتا ہے۔ قرآن کو اگر سنت سے الگ کر کے لیا جائے تو اس کے اصولی احکام کی تعبیرات میں اختلاف کرنے کا میدان غیر محدود حد تک وسیع رہتا ہے۔ بخلاف اس کے سنت کا انسٹی ٹیوشن تعبیرات و تاویلات کی جولانگاہ کے حدودِ اربعہ معین کرتا ہے اور فکر و تدبر کو ایک سیدھی راہ پر ڈال دیتا ہے۔ مثلاً قرآن سے اگر مجرد یہ حکم لے لیا جائے کہ نماز پڑھو اور سنت سے اس کی ہیئت و ترتیب اور اس کے کلمات و حرکات اور اس کے اوقات و آداب کو حاصل نہ کیا جائے تو کوئی دو شخص بھی نماز کے مقصد، اس کی ہیئت، اس کے کلمات، اس کے اوقات اور اس کے آداب و شرائط پر متفق نہیں ہو سکتے۔ یا مثلاً اگر حلت و حرمتِ ماکولات کا ضابطہ قرآن سے لیتے ہوئے اس کی تفصیل نبی صلعم سے نہ لی جائے تو بے شمار جانداروں کی حلت و

حرمت میں فرد فرد کا زاویۂ نظر مختلف ہو گا، یہاں تک کہ گتے تک کے بارے میں کوئی متفقہ رائے اختیار نہیں کی جاسکتی۔ یہی حال وراثت، نکاح و طلاق، قانونِ صلح و جنگ اور لین دین کے معاملات کا ہے۔ سنت کو اختیار کرنے سے انسانی فکر کی اختلاف پسند فطرت کو اتنی جولانگاہ بھی مل جاتی ہے کہ وہ مختلف حالات میں کوئی موزوں اجتہادی مسلک اختیار کر سکے، اور دوسری طرف یہ فطرت اتنا کھل کھیل بھی نہیں سکتی کہ سرے سے اتحاد و اشتراک کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں۔ سنت ہمارے فکر و نظام کو استقلال (STABILITY) دیتی ہے۔ یہی مشعل ہے جو قرآن کی ممکن تاویلات و تعبیرات کے ہجوم میں سے ہمارے سامنے صحیح راہِ فکر واضح کرتی ہے۔ اگر قرآن کے ساتھ نبی صلعم کی مستند توضیحات پیغمبرانہ اتھارٹی کے ساتھ موجود نہ ہوتیں اور آنحضورؐ کی پوری زندگی اس کے احکام اور تقاضوں کو متعین مفہوم دینے کے لیے ہمارے سامنے نور افشاں نہ ہوتی تو قرآن کے عقائد و احکام میں وہ لاینحل اختلافات برپا ہوتے جو بہتر فرقے تو کیا، بہتر ہزار امتیں برپا کر دیتے، بلکہ شاید ہر فرد اپنی جگہ ایک مستقل امت اور ملت ہوتا۔ یہ سنت ہی کا فیضان تھا کہ اہلِ سنت والجماعت میں جو علمی اختلافات واقع ہوئے انہوں نے صرف کلامی اور فقہی مدارسِ فکر پیدا کیے جن میں ہر ایک دوسرے مدارسِ فکر کو اسی طرح برسرِحق سمجھتا ہے جس طرح اپنے آپ کو۔ سنت نے ان کے باہمی اختلافاتِ فکر و تدبر کو بنیادی اصولوں اور قرآن کے جامع مفہومات میں کبھی متفرق نہیں ہونے دیا۔ دوسری طرف جن لوگوں نے بنیادی اصولوں اور قرآن کے جامع مفہومات میں گڑبڑ اور تفرقہ پیدا کیا، انہوں نے سنت کی مشعل یا تو گل کر دی، یا اسے کسی اعتقادی فتنے کی اوٹ میں چھپا دیا۔ مثلاً خوارج اپنے فاسد نظریات کو لے کر اُٹھے تو انہیں "حسبنا کتاب اللہ" کا نعرہ نہایت درجہ غلط مفہوم کے ساتھ بلند کرنا پڑا۔ یا مثلاً شیعہ حضرات نے قرآن کی آیات میں تصرف کرنا چاہا تو اس پر سے سنت کا پہرہ اٹھانے کے لیے سنت کا ایک جعلی ریکارڈ پیدا کیا۔ بعض بگڑے ہوئے اہلِ تصوف قرآن کے الفاظ کے باطن در باطن سے عجیب و غریب نکات پیدا کرنے کے درپے ہوئے تو انہوں نے ولایت کو نبوت سے افضل قرار دے کر وحی کے مقابلے میں کشف کا دروازہ کھول لیا۔ اور اس طرح سنتِ نبوی

کی اتھارٹی کو کمزور کردیا۔ پس درحقیقت سنت قرآن کی حقیقتوں اور تقاضوں اور احکام کی محافظ اور اس کے مفہومات پر امت کو جمع کرنے والی ہے اور اسے پراگندگی سے بچانے والی ہے۔ اس کے بارے میں ہمارے ایک اخبار نویس کا نظریہ بالکل اُلٹا ہے اور اس اُلٹے نظریے پر رتی بھر استدلال نہیں کیا گیا۔

سنت کا پارٹ ہماری تاریخ میں

سنت پر تفرقہ انگیزی کی تہمت باندھنے کے بعد پونے چودہ صدیوں کی تاریخ میں واقع ہونے والے سارے تفرقوں اور باہم آویزیوں کی ذمہ داری بھی اسی انسٹی ٹیوشن کے سر ڈال دی گئی ہے۔ امویوں، عباسیوں، فاطمیوں اور عثمانیوں کے دور میں جہاں کہیں کوئی غیر صحتمندانہ اختلافات پائے جاسکتے ہیں، فرید جعفری صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ (نعوذ باللہ) یہ سب شرارت سنت کی ہے۔ اتنا بڑا دعویٰ کس طنطنے سے کر دیا گیا ہے، لیکن اتنی لمبی چوڑی تاریخ میں سے دو چار واقعات بھی تعین کے ساتھ شہادت میں پیش نہیں کیے گئے۔ دلیل کے افلاس کی تو یہ حد ہے۔ فرض یہ کر لیا گیا ہے کہ "پاکستان اسٹینڈرڈ" کے دفتر کے باہر احمقوں کی ایک ایسی دنیا آباد ہے جو اس دفتر سے نشر ہونے والی ہر لغو سے لغو بات پر آمنا و صدقنا کہنے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ لیکن نہیں، دراصل جعفری صاحب جس خاص گروہ سے داد لینا چاہتے ہیں اس کے بارے میں ان کا گمان یہ ہے کہ وہ چونکہ دینی عناصر کے خلاف پہلے سے کد رکھتا ہے لہٰذا اس کے سامنے جو کچھ بھی الاپ دیا جائے گا اس پر کسی دلیل اور کسی شہادت کی سرے سے ضرورت نہیں ہے، وہ گروہ بے دھڑک مرحبا اور آفرین کے نعرے بلند کر دے گا۔ ایسے جذباتی لوگوں میں الگ بیٹھ کر آپ ان کی تسکینِ ذوق کے لیے جو چاہیں کرتے رہیں، لیکن بر سرِ عام سنتِ رسولؐ پر بھرپور حملہ کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے کہ اس پر کوئی محاسبہ کرنے والا نہ ہو۔ آپ نے اپنے دعویٰ کے حق میں تاریخ سے کوئی واقعاتی شہادت پیش نہیں کی، لیکن ہم آپ کے سامنے اس دعویٰ کی تردید میں واقعاتی شہادت پیش کرتے ہیں۔ ان چند مثالوں کو دیکھ کر آپ از سرِ نو غور کریں کہ کیا ایسے بے سروپا دعویٰ کو کھڑا کرنے کے لیے آپ کو کہیں زمین مل سکتی ہے!

مثال (۱) آنحضور صلعم کی وفات پر پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کے جسدِ مبارک کو کس مقام پر دفن کیا جائے۔ ذہن مضطرب ہیں، قرآن اس معاملے میں نہیں بولتا۔ یکایک ایک قولِ نبیؐ سامنے آجاتا ہے کہ نبی وہیں دفن ہوتا ہے جہاں اس کی وفات ہو۔ اس پر سارا اضطراب ختم ہو جاتا ہے اور امت ایک متفقہ فیصلے پر پہنچ جاتی ہے۔ آپ کا مدفن حجرۂ عائشہؓ صدیقہ ہی قرار پاتا ہے۔

مثال (۲) — آپ کے ترکہ کی تقسیم کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے جو بڑے جھگڑوں کا مسئلہ تھا لیکن جب یہ ارشادِ نبوت سامنے آجاتا ہے کہ ہم انبیاء جائدادیں اور وراثتیں نہیں چھوڑا کرتے، ہمارا جو کچھ ہے وہ وقفؐ العام ہے۔ تو قضیہ فیصل ہو جاتا ہے۔

مثال (۳) — سقیفہ بنو ساعدہ کی مجلسِ اعیان میں رسولؐ اللہ کے جانشین کی نامزدگی کے لیے سخت تند و تیز بحث چل پڑی۔

سعد بن عبادہ نے انصار سے کہا کہ فاستبد وا بھذا الامر دون الناس، فانہ لکم دون الناس یعنی آگے بڑھو اور زمامِ کار ہاتھ میں لے لو، تم ہی سب سے زیادہ حقدار ہو۔ متعدد لوگوں نے اس کی تائید کی۔

ایک آواز: "اگر اہلِ قریش نے نہ مانا تو کیا صورت ہو گی!"

دوسری آواز: "تو پھر ہم کہیں گے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو گا اور ایک امیر تم میں سے۔"

سعد بن عبادہ: "یہ کمزوری کا ظہورِ اوّل ہے۔"

---

۵ آنحضور صلعم نے ارضِ خیبر اور باغِ فدک سے متعین مقاصد کے لیے زندگی میں جو استفادہ فرمایا تھا وہ بطورِ سربراہ ریاست (HEAD OF THE STATE) تھا۔ اسکی نوعیت ذاتی اور نجی ملک کی نہیں تھی۔ لہٰذا اس ارشاد کی روشنی میں یہ زمینیں ریاست کی طرف منتقل ہو گئیں۔ اس بارے میں حضرت فاطمہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا کچھ مدت تک اطمینان نہیں ہوا، لیکن بہ حیثیت مجموعی صحابہ کی جمہوری سوسائٹی نے ان زمینوں کے تصرف کی صحیح پوزیشن کو سمجھ لیا اور خلیفہ کے شورائی فیصلہ کو تسلیم کر لیا۔ بعد میں شیعہ حضرات نے معاملہ کو اصل واقعہ سے بہت بڑھا چڑھا کر ایک مستقل نزاع بنا دیا۔

یہ بحث چل رہی تھی کہ امت کے تین بڑے لیڈر حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضوان اللہ علیہم اجمعین، مجلس میں داخل ہوئے۔ حضرت عمرؓ تندی سے کچھ کہنے لگے تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کو روک دیا اور نہایت ٹھنڈے انداز سے تقریر فرمائی۔ اس تقریر میں پہلے مہاجرین وانصار دونوں کی خدمات کا ذکر کیا، پھر مہاجرین کی علمی اور عملی افضلیت کو بیان کیا جس کا مذکور خود قرآن مجید میں ہے۔ لیکن بحث بہنر رُخ پر پڑ جانے کے باوجود کسی فیصلے پر منتج نہ ہو سکی۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک ارشادِ نبوت کی طرف توجہ لائی کہ "الائمۃ من قریش[1]" اور اس کی توضیح فرماتے ہوئے کہا کہ "فاما العرب فلن تعرف ھذا الامر الا لھذا الحی من قریش" (ابوبکر: محمد حسین ہیکل ص ۶۲) یعنی عرب سوائے قریش کے اور کسی کے اقتدار پر راضی نہیں ہو سکتا۔ پس بہترین طریق یہی ہو سکتا ہے کہ "فمنا الامراء ومنکم الوزراء"۔ اس پر تھوڑی سی گفتگو ہونے کے بعد اتفاق رائے پیدا ہو گیا۔ دیکھیے سنت (یا حدیث) نے کس طرح حالتِ انتشار کو اتفاق واجتماع میں بدل دیا۔

مثال (۴) ـــــ خلیفۂ اول کے دور میں سب سے پہلا مسئلہ جو مجلسِ شوریٰ میں پیش ہوا جیشِ اُسامہ کی ترسیل کا تھا۔ رومیوں کے خلاف جنگ موتہ (۸ھ) کے نتائج کو دیکھ کر نبی صلعم نے مرض الموت سے کچھ قبل یہ لشکر حضرت اُسامہ کی سرداری میں مرتب کیا تھا، مگر عین اس کے کوچ کے وقت آپؐ مرض الموت میں مبتلا ہو گئے۔ اس لیے معاملہ ملتوی ہو گیا۔ خلافتِ صدیقی کے انعقاد پر یہ مسئلہ از سرِ نو سامنے آگیا۔ اہلِ شوریٰ اس لشکر کی ترسیل کے خلاف تھے، کیونکہ رسول اللہ کی وفات اور مرتدین، مدعیانِ نبوت اور مانعینِ زکوٰۃ کے داخلی فتنوں نے جو ابتری کی کیفیت پیدا کر دی تھی اس میں ایک بہت بڑی بیرونی طاقت کے

---

[1] یہ ارشادِ نبوی حکمِ شرعی کے بجائے ایک امرِ واقعی کی تصریح کی نوعیت رکھتا ہے۔ رسول اللہ صلعم جہاں ایک طرف انتہائی اصول پسند تھے اور اس اصول پسندی کے تحت فرمایا تھا کہ اگر نکٹا حبشی غلام بھی امارت پر مامور ہو جائے تو اس کی بے چون وچرا اطاعت کرنا عین تقاضائے دین ہے۔ وہاں ایک عملی رہنما کی حیثیت سے امرِ واقعی کو بھی پوری اہمیت دی کہ عرب میں قریش کے علاوہ اور کسی کا اقتدار چلنے کا نہیں۔ آپؐ اصول پسند تھے مگر خیالیت پسند (UTOPIAN) نہیں تھے۔

خلاف لشکر کشی کرنا ان کی نگاہ میں خطرناک اقدام تھا۔ اس بحث و تمحیص کا خاتمہ حضرت ابوبکرؓ کے ان عزیمت مندانہ الفاظ پر ہوتا ہے کہ " والذی نفس ابی بکر بیدہ، لوظننت ان السباع تخطفنی لانفذت بعث اُسامۃ کما امر بہ رسول اللہ صلعم، ولو لم یبق فی القریٰ غیری لانفذتہ[1] (ابوبکر: محمد حسین ہیکل ص ۹۶) یعنی اگر مجھے یہ اندیشہ ہو کہ اس کارروائی پر مجھے درندے پھاڑ کھائیں گے، یا یہ کہ میرے سوا ان بستیوں میں کوئی باقی نہ رہے گا تو بھی اُسامہ کو رسول اللہ صلعم کے فیصلے کے بموجب ضرور روانہ کروں گا"۔

کچھ اور قیل و قال ہوئی تو پھر مزید حزم و جزم سے فرمایا کہ " لو خطفتنی الکلاب والذئاب لم ارد قضاءً قضی بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابوبکر: محمد حسین ہیکل ص ۹۶) " یعنی اگر مجھے کتے اور بھیڑیے بھی اُچک لے جائیں تو بھی میں رسول اللہ کے اس حکم کو نہیں بدل سکتا جس کا آپ نے فیصلہ فرمایا ہے۔ اس پر بحث ختم ہو گئی۔

مثال (۵) ــــ اسی جیشِ اُسامہ کے سلسلے میں انصار نے حضرت عمرؓ کی معرفت خلیفۂ اول کی خدمت میں کہلوایا کہ آپ اگر لشکر کو بھیجتے ہی ہیں تو کم سے کم اس کا سردار تو کسی تجربہ کار اور پختہ سال شخص کو مقرر کیجیے یہ سن کر خلیفۂ اوّل نے حضرت عمرؓ کی ڈاڑھی پر ہاتھ رکھ کر تیز لہجے میں کہا کہ " استعملہ رسول اللہ صلعم وتامرنی ان انزعہ" (ابوبکر، محمد حسین ہیکل ص ۹۷) یعنی اُسامہ کو رسول اللہ صلعم مامور فرما گئے اور اب تم مجھے یہ مشورہ دیتے ہو کہ میں اسے ہٹا دوں؟ ۔ اس حوالے پر بات معاً ختم ہو گئی۔ پھر لشکر کی ترسیل کے موقع پر جو تقریر کی اس میں پھر اپنی پوزیشن کو واضح کرنے کے لیے یہ فرمایا کہ " وانما انا متبع ولست بمبتدع (ایضاً ص ۹۷) یعنی میں آنحضور صلعم کی پیروی کرنے والا ہوں، مبتدع (یا جدید الفاظ میں تجدد پسند) نہیں ہوں[2]"۔

---

[1] یہ تسلیم کہ جیشِ اُسامہ کی ترسیل کا معاملہ ایک انتظامی حکم کے تحت تھا اور انتظامی حکم میں التوا اور رد و بدل دونوں ممکن تھے، لیکن صحابۂ کرام کے ذہن کی ساخت تربیتِ نبوی سے بنی ہی ایسی تھی کہ آپؐ کے ارشادات سے روگردانی کی جسارت کسی میں نہ تھی۔ کجا کہ معاملہ شرعی احکام کا ہو۔

[2] مزید الفاظ یہ ہیں: " انی واللہ ما ادع امراً رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصنعہ الا صنعتہ "۔

پالیسی کے اس اصولی ڈیکلریشن کے بعد کلّی اطمینان پیدا ہو گیا۔

مثال (۶) — مانعین زکوٰۃ کے فتنہ کو فرو کرنے کی اسکیم زیر بحث آئی تو حضرت عمرؓ نے کچھ تو نظریاتی وجوہ سے اور کچھ مصالح سیاسیہ کے تحت یہ رائے دی کہ ان سے قتال نہ کیا جائے۔ نظریاتی لحاظ سے تو خلیفۂ اوّل نے دوسرا جواب دیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مصالح کے بالمقابل یہ فرمایا کہ خدا کی قسم اگر یہ لوگ اس زکوٰۃ میں سے ایک رسّی بھی روک رکھیں گے جو رسول اللہ صلعم کو دیا کرتے تھے تو میں ان کے خلاف جنگ کروں گا۔ یعنی جن اموال میں جس شرح سے رسول اللہ صلعم نے زکوٰۃ اخذ فرمائی ہے اس میں اب کوئی ردّو بدل نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر کوئی سنت سے انحراف کر کے نظام اسلامی سے سرکشی کرے گا تو اس کی اصلاح تلوار سے کی جائے گی۔

یہ چند مثالیں صرف ایک خلیفۂ راشد کے بالکل ابتدائی دور سے ماخوذ ہیں۔ مزید کاوش سے صدہا صد واقعاتی شواہد پیش کیے جا سکتے ہیں جو سنت کے جامع امت ہونے پر دال ہیں۔ خلافت راشدہ تو خیر ایک نورانی دور تھا، بعد میں بھی جہاں کہیں کسی عالم انتشار میں سنّت نمودار ہوگئی، سارا طوفان تھم گیا۔ اس کی ایک مثال سیرت امام احمد بن حنبل (ملاحظہ ہو: ایشیا، لاہور، جلد ۴ شمارہ ۸) میں سامنے آتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مسئلہ "خلقِ قرآن" ایک ایسا فتنہ بن کر نمودار ہوا جس نے اسلامی سوسائٹی کو سخت درجے کے ذہنی انتشار میں ڈال دیا اور کتنے ہی علمائے حق اس سلسلے میں مظالم کا شکار ہو گئے۔ واثق کے دربار میں ایک بزرگ تشریف لائے تو احمد بن داؤد نے ان بزرگ کو بھی درباری نظریے کی دعوت دی۔ ان بزرگ نے اس کے جواب میں کہا کہ جس بات کی طرف دعوت نہ رسول اللہ صلعم نے دی، نہ حضرت ابوبکر اور باقی خلفائے راشدین نے، تم لوگوں کو اس کی طرف کیوں بلاتے ہو۔ اب تم رسول اللہ اور صحابہ کے بارے میں یا تو یہ کہہ سکتے ہو کہ وہ اس مسئلے سے بے خبر تھے، یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس پر سکوت اختیار کیا۔ اگر ان کو اس کا علم نہ تھا تو تم کو کہاں سے حاصل ہو گیا اور اگر انہوں نے علم کے باوجود سکوت اختیار کیا اور اس پر کوئی بحث نہیں چھیڑی تو تم بھی سکوت اختیار کرو اور دوسروں کو بھی سکوت اختیار کرنے دو۔ اس قول نے واثق کا ذہن یکسر بدل دیا اور مدتوں کا پھیلا ہوا انتشار ختم ہو گیا۔ ہماری

پوری کی پوری تاریخ واقعاتی شہادت صرف اس بات پر بہم پہنچاتی ہے کہ مسلمانوں میں ہمیشہ ترکِ سنت سے انتشار پیدا ہوا اور قبولِ سنت نے سب کو جمع کر دکھایا۔

اقبال کے یہ اشعار پڑھیے اور پھر تاریخ کا مطالعہ فرمائیے :۔

از رسالت در جہان تکوینِ ما ‏ ‏ ‏ از رسالت دینِ ما، آئینِ ما
از رسالت صد ہزار ما یک است ‏ ‏ ‏ جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است
از رسالت ہم نوا گشتیم ما ‏ ‏ ‏ ہم نفس، ہم مدعا گشتیم ما

یہ آپ کی قوم کے اس بصیرت مند شخص کا ذہن ہے جسے آپ حکیم الامت اور شاعرِ مشرق کہہ کہہ کر فخر کرتے ہیں۔ وہ آپ کو بتاتا ہے کہ رسالت اور اس کا اسوہ اور اس کی سنت وہ طاقت ہے جو ہماری تکوین کا وسیلہ ہے، جو ہمارے صد ہزار افراد کو ملا کر ایک ملت بناتی ہے، جو ہمارے اجزا کو باہم دگر لاینفک کر دیتی ہے، جو ہمیں ہم نوا، ہم نفس اور ہم مدعا بناتی ہے۔ واضح رہے کہ یہاں فیضانِ رسالت سے محض قرآن مراد نہیں ہے بلکہ قطعی طور پر سنت مراد ہے۔ کیونکہ آپ کے اس حکیم الامت نے آگے تصریح کر دی ہے کہ "فرد از حق، ملت از وے زندہ است"۔ یعنی خدا تعالیٰ پر ایمان اور اس کے وحی کردہ قرآن کا اتباع کر لینا فرد کو اسلامی زندگی کے سانچے میں ڈھالتا ہے، لیکن افراد کو جوڑ کر اور ان کے اختلافات کو ختم کر کے ایک امت میں بدلنے والی طاقت رسالت اور اس کی سنت کی طاقت ہے۔

سنت اور تجدد | فرید جعفری صاحب کو اپنی تاریخ کے بارے میں یہ جامع سا سرسری تصور بھی حاصل نہیں ہو سکا کہ خلافتِ راشدہ کے سقوط کے بعد بادشاہت کا ظہور ہمارے اہلِ سنت اور متجددین کی کشمکش میں متجددین کے برسرِ اقتدار آجانے سے ہوا ہے اور بعد کے تمام فتنوں کی ذمہ داری "سنت" پر نہیں بلکہ "تجدد" پر عائد ہوتی ہے۔ تجدد نے ہمارے ہاں نت نئے گل کھلائے ہیں اور سنت کا پارٹ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اس نے ہر غیر اسلامی نظریے اور اقدام کے خلاف ملت کے اندر سے صدائے احتجاج ابھاری ہے۔ کیا یزید اور حجاج اور ابن ہبیرہ ...... جیسے بادشاہ حاملینِ سنت تھے اور یہ تجدد کے خلاف معرکہ آرا رہے ہیں؟ اس طرح کے لوگ قرآن اور سنت دونوں سے بے پروا ہو کر ایسی کارروائیاں کرتے رہے ہیں

جنہوں نے ساری تاریخ کو آلودہ کر دیا۔

البتہ ایسی مثالیں آپ ضرور پیش کر سکتے ہیں کہ ہمارے اس طرح کے بادشاہوں نے جاہ پسند اور بزدل علماء کو ساتھ لے کر ان کو اپنے مقاصد میں خوب خوب استعمال کیا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ علماء سُو نے ان کے اقتدار کی پاسبانی احادیث پڑھ پڑھ کر اور سنتِ رسولؐ کو پیش کر کر کے کی ہو گی۔ لیکن یہ ظلم تنہا سنت پر ہی نہیں، خود قرآن پر بھی برابر سرا بر حد تک توڑا جاتا رہا ہے۔ یہ چیز اگر ترکِ سنت کی دلیل بن سکتی ہے تو بدرجۂ اولیٰ ترکِ قرآن کی دلیل بھی بن سکتی ہے۔

قرآن اور سنت کا یہ بے جا استعمال اس بات کا ثبوت نہیں ہو سکتا کہ خود قرآن یا سنت میں کوئی وجہِ فساد موجود ہے بلکہ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کی ہیئتِ اجتماعی کو جب بھی اس کی فطرت کے خلاف کسی ساخت پر استوار کیا جائے گا اور جب بھی کتاب و سنت سے بے نیاز قسم کے متجددین اس پر آ کے مسلط ہو جائیں گے تو لازماً ہر پہلو سے اس میں ایسا فساد برپا رہے گا جس میں خیر و برکت کے سرچشمے بھی پوری طرح خیر و برکت بہم نہیں پہنچا سکیں گے۔ بلکہ اُلٹا ان سے انتشار انگیزی کا کام لیا جانے لگے گا۔ اسلامی معاشرہ کی غیر صحت مندانہ ساخت سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو سنت کے سر جا تھوپنا بڑی جسارت ہے۔

دوسری طرف اگر آپ اپنی تاریخ کے کسی ایسے دور کو لیں جس میں کوئی حاملِ سنت برسرِ اقتدار آ گیا ہو تو اس دور میں آپ کتاب و سنت کے خیر و برکت کا بہاؤ پوری طرح محسوس کریں گے۔ مثلاً حضرت عمر بن عبد العزیز کو ایک مختصر مدت کے لیے کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ آپ اس دور میں ہونے والی اصلاحات اور تبدیلیوں کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ عام لوگوں کے دینی، اخلاقی، معاشی اور انتظامی مفاد کس طرح بحال ہو جاتے ہیں اور شاہانہ جباریوں اور ظالمانہ کارروائیوں اور غیر اسلامی پالیسیوں کا کس طرح خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح کا ہر دور دلیل ہے اس بات پر کہ سنت ہمارے معاشرے کو ہمیشہ اس کی فطرت کے مطابق صحت مندانہ ہیئت پر لے آنے کا ذریعہ رہی ہے اور موجباتِ تفرقہ و انتشار کا خاتمہ کرنے کا وسیلہ بنتی چلی آئی ہے۔

اب ہمیں فرید جعفری صاحب یہ بتائیں کہ انہوں نے کونسی تاریخ ملت پڑھی ہے جس میں انہوں نے سنت کو تفرقہ انگیزی کرتے دیکھا ہے!

ماہرین سنت کا اختلاف پھر فرمایا گیا ہے کہ کوئی دو ماہر رسولؐ کی روایات پر متفق نہیں ہو سکتے!

اوّل تو یہ بڑی ڈراؤنی سی بات یونہی گھڑ کر ڈال دی گئی ہے اور شاید کسی انتہائی زوال یافتہ دور میں بھی تعبیرِ سنت کے معاملے میں ایسی مضحکہ انگیز کشمکش نہ ملے گی جس کا نقشہ اس عبارت میں کھینچا گیا ہے۔ اختلاف اگر پائے بھی جاتے ہیں تو یہ کوئی انوکھی صورتِ حالات نہیں ہے۔ ہر قانونی نظام میں اسی طرح کا فکری تنوع برسرِ عمل رہتا ہے اور اس تنوع کی وجہ سے ایک نظام مختلف قسم کے حالات کی ذمہ داریوں اور مختلف نوعیت کے جزئی معاملات سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنتا ہے۔ یہ کوئی غیر صحت مندانہ حالت نہیں کہ اس پر تالی پیٹ دی جائے۔ کسی بھی ملک کو سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوئی سے دو جج اور دو وکیل قانون کے اصولوں کی تعبیر میں متفق نہیں ہو سکتے۔ اب کیا اتنی سی ناگزیر حقیقت کو لے کر یہ اعلان کیا جا سکتا ہے کہ کوئی پیش نظر قانونی نظام ہی ایسا ہے کہ وہ اپنے ماہرین کو متفق ہونے نہیں دیتا۔

دوسری بات یہ سامنے رکھنی چاہیے کہ اگر اختلافات کہیں حدود کو پھاند کر موجبِ تفرقہ بنتے بھی ملتے ہیں تو ان کی اصل وجہ نظامِ حکومت و معاشرہ کا مجموعی فساد ہے۔ ایک ایسی حالت جس میں نہ قرآن کو اپنے اصل مقام پر رکھا گیا ہو، نہ سنت کو اس کا صحیح مرتبہ دیا گیا ہو، بلکہ ساری ترتیب بالکل غیر فطری نہج پہ قائم کر دی گئی ہو تو وہاں نہ قرآن اپنے معجزے دکھا سکتا ہے اور سنت اپنی برکات سے معاشرہ کو مالا مال کر سکتی ہے۔ اسلامی نظامِ فکر و قانون کا صحیح چلن اس صورت میں ممکن ہے جب کہ نظامِ تعلیم بہترین نہج پر نئی نسلوں کے ذہن بنا رہا ہو، جبکہ اسلامی مجلسِ شوریٰ (پارلیمنٹ) میں مسائل باقاعدگی سے زیرِ بحث آ کر کسی اجماعی فیصلے پر منتج ہو رہے ہوں، جبکہ عدالتی نظام اس قانون کو روزمرہ زندگی کے معاملات پر عملاً منطبق کر رہا ہو۔ لیکن جب نظامِ تعلیم کسی نظامِ فکر و قانون کو اٹھا کے اپنی حدود سے باہر پھینک دے، پارلیمنٹوں میں بحث ہو کر اس کے متعلق نقطۂ اشتراک طے نہ کیا جا سکتا ہو اور عدلیہ کے ذریعے اسے عملی زندگی سے وابستہ نہ رکھا جا سکے، بلکہ افراد اپنے طور پر اسے سیکھیں اور سمجھیں اور اسے پھر نظری

بحثوں کا میدان بنائے رہیں تو ایسی صورت میں اختلافات اپنی فطری حدود میں نہیں رہ سکتے۔ یہی وہ حالت ہے جس نے صرف سنت ہی کے دائرے میں نہیں، خود قرآن کی تعلیمات میں بعض ایسی نامطلوب اختلافی بحثیں پیدا کر دی ہیں جن کو آڑ بنا کر اب سارا حملہ سنّت کے خلاف کیا جا رہا ہے۔

ہم اپنے بھائی فرید جعفری صاحب سے التماس کرتے ہیں کہ وہ براہ کرم سنت کے بارے میں ایک بہت ہی بڑی تفرقہ انگیز بحث شروع کرتے ہوئے معاملات کی گہرائی میں جانے کی کوشش کریں۔ ان گذارشات سے مطلوب بحث برائے بحث نہیں اور نہ ان کے پیچھے کسی طرح کا معاندانہ یا متعصبانہ جذبہ کارفرما ہے۔ ہم نے صرف یہ چاہا ہے کہ ہمارے ملک کے ایک مسلمان صحافی کو کم سے کم اس ذمہ داری کا احساس دلایا جائے کہ جب اجماع امت کے خلاف بڑے بڑے دعوے میدان بحث میں پیش کرنے ہوں تو ان کے ساتھ دلائل و شواہد کا زور موجود ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہم نے اپنی طرف سے ان بے بنیاد جذباتی دعووں کے بودے پن کو واضح کرنے کے لیے اپنے دلائل و شواہد پیش کر دیے ہیں۔ چاہیے یہ کہ فرید جعفری صاحب اپنے دعاوی پر نظر ثانی فرمائیں اور جس شئے کے لیے وہ دلیل نہ رکھتے ہوں اسے واپس لے لیں اور جس شے پر وہ اپنے آپ کو مضبوط استدلال سے مسلح پاتے ہوں اس پر اپنا سرمایۂ استدلال دوسروں کے سامنے رکھ دیں۔ کسی معقول آدمی کو یہ بہرحال زیب نہیں دیتا کہ وہ گروہی تعصبات میں پڑ کر صندم صندا پر اُتر آئے اور غلط بات کہہ کر پھر ناک اونچی رکھنے کے لیے غلط بات کو پکڑ کر بیٹھ جائے۔